اقبالؔ، قاری اور قرأت

پروفیسر قدوس جاوید *
Prof. Quddos Javed

Abstract:
"Iqbal is the prominent figure of 20th century. He has an impact on the Urdu literature, especially on poetry. Prof. Quddos Javed has made effort to analyse the poetry of Iqbal according to the postmodern theories especially the reader oriented theory. He has implied it find out the meaning by using the technique of close reading analyzing the form and diction as well."

"تخلیقی عمل بھید بھرا بستہ ہے۔ تنقید اس کی تھاہ لانے کا دعویٰ نہیں کر سکتی، فقط قرات کی بناء پر رائے قائم کر سکتی ہے، وہ بھی صرف ان عوامل کے بارے میں جو تخلیقی عمل کی خصوصیات خاصہ سے تعلق رکھتے ہوں"(۱)

تخلیقیت کا تعلق صرف اظہار سے ہی نہیں متن کی ترسیل اور قبولیت سے بھی ہوتا ہے اسی بناءپر شعر و ادب کی تعین قدر کے نئے نظریات (Theories) متن کی قرأت اور تفاعل، قاری کی قماش اور رد عمل کو بھی زیر بحث لاتے ہیں چنانچہ اقبال کی تخلیقیت کی علویت اور معنویت کا جائزہ قاری اور قرأت کے حوالے سے بھی لینا از بس ضروری ہے۔

اقبال کی تخلیقیت کی تفہیم کا عمل: قاری سے مخصوص افتاد طبع اور قرأت کے منفرد آداب کا مطالبہ کرتا ہے۔ سبب یہ ہے کہ شعر اقبال اس غیر معمولی تاریخی، عمرانی، ثقافتی اور جمالیاتی شعور کا زائیدہ ہے جو اقبال کے یہاں اسلامی ہندوستانی اور یورپی نظریات حیات اور اقدار و روایات فن کے بصیرت مندانہ تجزیہ و تحلیل کے نتیجے میں وجود میں آیا تھا، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اقبالؔ کی تخلیقیت، بحیثیت مجموعی اردو شعری جمالیات کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے بھی شعری جمالیات کے عام مفہوم سے باہر کی طرف جست لگاتی ہے اقبال کے تخلیقی تجربات، افکار و نظریات قاری کے طے شدہ تاریخی، عمرانی، ثقافتی حتیٰ کہ مذہبی شعور کی بالیدگی کا سبب بنتے ہیں لیکن ایسا اسی

☆ سابق صدرِ شعبۂ اردو، کشمیر یونیورسٹی، کشمیر

وقت ممکن ہوتا ہے جب ایک معیار اور مقام پر فائز قارئین شعر اقبال کی تفہیم کے لیے قرات کا بھی غیر روایتی انداز اپناتے ہیں، ورنہ شعر اقبال کے شعری و لسانی نظام ہی نہیں فنی و فکری اجتہادات کی بھی ہمہ جہت تفہیم و تعبیر کے باب میں تنقید کے سابقہ رویے اصول اور سانچے عام طور پر ناکافی ثابت ہوتے رہے ہیں اور اقبالیات پر ہزاروں لاکھوں صفحات سیاہ کئے جانے کے باوجود اکثر یہ محسوس ہوتا ہے جیسے اقبال شناسی کے باب میں ''کہیں کچھ کم ہے۔''

اگر یہ بات درست ہے تو اس کے اسباب کیا ہیں؟ جواب کئی ہو سکتے ہیں لیکن مابعد جدید لسانی و ادبی تھیوریز اور خصوصاً متن سے اخذ معنی سے متعلق تصورات کے حوالے سے ایک بات یہ کہی جا سکتی ہے کہ اقبال کا متن، مخصوص و منفرد شعری و فکری دروبست کی بناء پر، عام طور پر پیچیدہ اور تہہ دار ہوتا ہے۔ اقبال کے متن کی خارجی ساخت میں جو شعری تجربہ (Poetic Experience) جوہر (Essence) یا معنی یا مفہوم بادی النظر میں ٹھوس مطلق (absolute) اور ابھری شکل میں نظر آتا ہے واقعتاً وہ شعری تجربہ جوہر یا معنی متن کی داخلی ساخت میں اقبال کے لسانی برتاؤ، شعری التزام اور فکری انفراد و اجتہاد کے سبب سیال حالت میں ہوتا ہے اور معنی و مفہوم اور کیفیت و تاثر کے ایک سے زائد (Surplus) تصورات و مفروضات کے امکانات رکھتا ہے۔ متن کی قرأت کے نتیجے میں سارے معنوی اور تاثراتی امکانات فعال اور متحرک ہو کر قاری کو اقبال کے متن کے اصل شعری تجربے کی بازیافت اور اس کی لسانی شعری اور فکری تہوں اور طرفوں کی واشگافی کی راہیں ہموار کرتے ہیں لیکن یہ بات اقبال کے عام قارئین اور قرأت کے عمومی انداز کے حوالے سے نہیں کہی جا سکتی کیونکہ اقبال کا عام قاری اقبال کے متن کی عمومی قرأت ارادی طور پر قائل ہونے یا قائل کرنے کی غرض سے کرتا ہے۔ یہ ''عام قاری'' آئی اے رچرڈ کے قول کے مطابق سائیکل کے پہیوں کی طرح متن کے سطحی معنی و مفہوم اور وزن و بحر کے چکر میں ہی گھومتا رہتا ہے اور نہیں جانتا کہ کس منزل کی طرف جا رہا ہے کیونکہ اسے اس بات کا علم ہی نہیں کہ جب تک الفاظ کے برتاؤ کی گہرائیوں میں اتر کر متن کے شعری اور فنی مضمرات کی تہوں کو نہ کھولا جائے۔ اقبال (یا کسی بھی شاعر) کے متن کے اصل شعری تجربے، فکر یا تصور کی گہرائیوں تک رسائی یا اس کی تشفی بخش حصولیابی (Reception) کے لیے نہ صرف غیر معمولی، فکر و نظر کا حامل، باذوق، شعر فہم اور تربیت یافتہ قاری کی، بلکہ اقبال کے متن میں موجود بین المتونی (Inter Textual) اکتسابات، حوالوں (References) اور اشاروں کی بناء پر قرأت کے مخصوص آداب کی بھی ضرورت ہے۔

ایسا اس لیے بھی کہ متن سے اخذ معنی و تاثر کا عمل اسی وقت شروع ہوتا ہے جب قاری متن کی قرأت کرتا ہے کیونکہ "متن خود کار نہیں ہوتا، متن کو فعال اور با معنی قاری اپنی قرأت کے ذریعے بناتا ہے"۔ دوسرے لفظوں میں الفاظ کے تخلیقی، لسانی برتاؤ اور شعری و معنیاتی نظام کی بناء پر متن (نظم یا شعر) میں ابھرے یا تہہ دار وحدانی یا تکثیری، طے شدہ یا آزاد، معنی و مفہوم، کیفیت و تاثر کے امکانات تو ہوتے ہیں لیکن انہیں اپنی استعداد، ذوق اور معیار کے مطابق قاری ہی قرأت کے ذریعے 'موجود' بناتا ہے۔

متن (شعر، نظم) میں معنی و مفہوم کی تخم ریزی (Dissemination) شاعر کا اپنا معاملہ ہے اور متن سے اخذ معنی قاری کا اپنا اور شاعر اور قاری دونوں ہی اپنے اپنے معاملات میں آزاد ہیں۔ پھر بھی چونکہ شاعری میں موجود شعری جوہر معنی و مفہوم اور تخلیقی تجربہ ایک ہی شعری صداقت (Poetic Reality) کے مختلف نام ہیں اور شاعر متن (شعر نظم) میں اپنا جو بھی تخلیقی تجربہ پیش کرتا ہے وہ کسی ٹھوس، حتمی اور یک رخی صورت اور حالت میں نہیں ہوتا بلکہ شاعر کی فنی و فکری گہرائی، الفاظ کے لسانی برتاؤ اور شعری و معنیاتی التزام کے سبب ایک سے زیادہ معنیاتی اور جمالیاتی ابعاد (Dimensions) رکھتا ہے اس لیے ان ابعاد کے درمیان 'متن میں کچھ نہ کچھ جگہیں خالی (Blank) ہوتی ہیں جنہیں صرف قاری بھر سکتا ہے"[۱] اور تشفی بخش حد تک مربوط اور واضح معنی و مفہوم اخذ کر سکتا ہے۔ اس ضمن میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک ہی قاری کسی متن سے ایک سے زیادہ معنی و مفہوم اخذ کرے یا پھر ایک سے زیادہ قارئین کسی متن کی ایک ہی جیسی تعبیریں پیش کریں۔ اقبال کے متون کی تفہیم و تعبیر کے حوالے سے یہ دونوں صورتیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اس کی وجہ قارئین کے ذوق، ذہنی ساخت، انفرادی شعور، اجتماعی لاشعور، ماحول اور تربیت کا فرق تو ہے ہی، متن کی نوعیت، قاری کی قماش اور قرأت کے انداز کا اختلاف اور انفراد بھی ہے۔ رولاں بارتھ کے نقطہ نظر سے دیکھیں تو اقبال کے یہاں بھی دو طرح کے متن ملتے ہیں ایک وہ جسے بارتھ نے سبقی یا قرأتی متن (Readerly Text) کہا ہے اور دوسرا وہ جسے تخلیقی متن (Writerly Text) کہتے ہیں سبقی متن چونکہ ذوق، ماحول اور ذہنی ساخت کے معیار کے اعتبار سے قاری کی توقعات سے مطابقت رکھتا ہے اس لیے قاری ایسے متن کی "عمومی قرأت" کرتا ہے۔ قرأت کے ساتھ ہی ایسے متن کے معنی و مفہوم اور کیفیت و تاثر قاری کی عام سوچ اور فکر پسند اور ناپسند سے فوری رشتہ قائم کر کے قاری کو عام سی مسرت اور طمانیت بخشتے ہیں۔ اقبالؔ کے اس طرح کے متون

کی مثالیں انسان اور بزم قدرت، زہد اور رندی، تصویر درد، حقیقت حسن، عقل و دل وغیرہ نظموں میں دیکھی جاسکتی ہیں یا پھر اس طرح کے اشعار میں:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

انوکھی وضع ہے، سارے زمانے سے نرالے ہیں
یہ عاشق کونسی بستی کے یارب رہنے والے ہیں

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی

اپنے من میں ڈوب کر پاجا سراغ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن، اپنا تو بن!

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا، نہ تن!

اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاجِ ملوک
اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا دارا و جم!
اے مسلماں! اپنے دل سے پوچھ، مُلّا سے نہ پوچھ
ہو گیا اللہ کے بندوں سے کیوں خالی حرم؟

بارتھ نے ایسے اکہرے معنی کے پابند متن کو بند متن (Closed Text) کہا ہے اور اس کے قاری کو صارف (Consumer)۔ اقبالؔ کے ایسے متون کی قرأت ان متون کو فعال اور متحرک تو بناتی ہے لیکن ایسے متون چونکہ قاری کے عمومی ذوق اور سمجھ سے مطابقت رکھتے ہیں اور ان میں معنیاتی گہرائی اور جمالیاتی بوقلمونیت سے زیادہ تاریخی و ثقافتی اور ایمانی و ایقانی جذباتیت کا

غلبہ ہے۔ اس لیے قاری کو ایسے کسی متن کے معنی و مفہوم کو اپنی سمجھ کے مطابق موجود بنانے میں دشواری نہیں ہوتی۔ دوسری بات یہ کہ اقبالؔ کے ایسے متون کا قاری چونکہ اقبالؔ کا ''قائل قاری'' ہوتا ہے اس لیے ایسا قاری مندرجہ بالا نظموں اور اشعار جیسے متون کی عمومی قرأت کرتا ہے اور اقبالؔ (مصنف) کی منشاء کے مطابق اس کی لسانی اور فکری رہنمائی میں ہی متن کے معنی و مفہوم اور کیفیت و تاثر کے ان مرحلوں تک جا پہنچتا ہے جن مرحلوں تک شاعر اسے پہنچانا چاہتا ہے۔ ایسے متون میں فکری ربط و تسلسل اور شعری آہنگ تو ہے لیکن ویسی لسانی اور شعری تہہ داری نہیں جو شعر کو بڑا بناتی ہے اور جس کے سبب قاری کے اندر اپنے تمام تر لسانی، ثقافتی اور شعری شعور اور قوت فہم و ادراک کو بروئے کار لا کر آزادانہ متن کی تہوں کو کھولنے اور متن کے عمق اور اس کے عواقب تک پہنچنے کی تڑپ پیدا ہوتی ہے۔ دوسری جانب اقبال کے یہاں ایسی نظمیں اور اشعار بھی کثرت سے ملتے ہیں جنہیں ہم تخلیقی یا تصنیفی متن کے زمرے میں رکھ سکتے ہیں۔ ایسے متون اپنے کے معنی کے پابند متن کو بند متن (Closed Text) کہا معنیاتی اور جمالیاتی امکانات کی ترسیل کے لیے منتخب قاری اور مخصوص قرأت کے متقاضی ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر شمع اور شاعر، شعاع آفتاب، خضر راہ، طلوع اسلام، مسجد قرطبہ، ساقی نامہ وغیرہ نظموں کو ذہن میں رکھیں اور پھر ان نظموں کے درج ذیل اشعار پر غور کریں:

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی!

جادوئے محمود کی تاثیر سے چشم ایاز
دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں سازِ دلبری

مجلس آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طبِ مغرب میں مزے میٹھے، اثر خواب آوری!

ساحرِ الموطؔ نے تجھ کو دیا برگِ حشیش
اور تو اے بیخبر سمجھا اسے شاخِ نبات!

آفتابِ تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا
آسماں !ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

باغبانِ چارہ فرما سے یہ کہتی ہے بہار
زخم گل کے واسطے تدبیر مرہم کب تلک؟

تو نے دیکھا سطوتِ رفتارِ دریا کا عروج
موجِ مضطر کس طرح بنتی ہے اب زنجیر دیکھ

اثر کچھ خواب کا غنچوں میں باقی ہے تو اے بلبل
"نوا را تلخ تری زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی"

آخر شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ
صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا

اور اب اقبالؔ کی غزلوں کے یہ اشعار بھی دیکھئے:

میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں بتکدۂ صفات میں

عشق بھی ہو حجاب میں حسن بھی ہو حجاب میں
یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر

نغمہ نو بہار اگر میرے نصیب میں نہ ہو
اس دم نیم سوز کو طائرک بہار کر

ٹھہر سکا نہ ہوائے چمن میں خیمہ گل
یہی ہے فصل بہاری، یہی ہے بادِ مراد

وہ عشق، جس کی شمع بجھا دے اجل کی پھونک
اس میں مزا نہیں تپش و انتظار کا!

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے!

دگرگوں ہے جہاں، تاروں کی گردش تیز ہے ساقی
دلِ ہر ذرّہ میں غوغاے رستا خیز ہے ساقی!

جمیل تر ہیں گل و لالہ فیض سے اس کے
نگاہِ شاعرِ رنگیں نوا میں ہے جادو!

مری مشّاطگی کی کیا ضرورت حسنِ معنی کو
کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنابندی!

عشق کی اک جَست نے طے کر دیا قصّہ تمام
اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھتا تھا میں

محمدؐ بھی ترا جبریل بھی، قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا

اردو میں حالیؔ اور شبلیؔ، ظفرؔ علی خان اور محمد علی، حسرتؔ موہانی اور اکبرؔ الٰہ آبادی نے اصلاحی، سیاسی اور انقلابی نظموں کا ایک بڑا سرمایہ بہم پہنچایا ہے اور یہ بھی غلط نہیں کہ ایسی نظموں کے ساتھ ساتھ اردو غزل بھی اپنے روایتی مضامین کے دائرے کو توڑ کر سیاسی، سماجی اور انقلابی موضوعات نئی زبان اور تازہ کار شعری رویے اپناتی ہے لیکن سچ یہ بھی ہے کہ اس شعری سرمائے میں اکثر و بیشتر نظموں اور غزلوں کی شاعری، صحافتی شاعری کہلانے کی سزاوار ہے۔ اقبالؔ کے یہاں بھی ایسی صحافتی شاعری کی مثالیں موجود ہیں۔ اوپر اقبالؔ کی جن نظموں اور غزلیہ اشعار کا ذکر، قرأتی متون کے طور پر کیا گیا ہے۔ اُن پر صحافتی شاعری کا لیبل تو چسپاں نہیں کیا جاسکتا لیکن ان متون میں وہ مخصوص و منفرد لسانی شعری اور فکری رمق بھی نہیں جو اقبالؔ کا خاصہ ہے اور جس کی بدولت اقبال کی تخلیقیت عام شعراء ہی نہیں بسا اوقات میرؔ و غالبؔ کی تخلیقیت سے بھی الگ بلکہ ممتاز نظر آتی ہے۔ دراصل ایسے قرأتی متون، اقبالؔ کی آزاد اور فطری تخلیقیت سے زیادہ اقبال کی طے شدہ مقصدیت اور عینیت پرستی کے زائیدہ ہیں لہٰذا اقبالؔ کے ایسے اصلاحی، ایمانی اور اخلاقی متون بعض پہلوؤں سے کشش تو رکھتے ہیں لیکن قاری سے قرأت، اخذ معنی اور لطف اندوزی کے لیے غیر معمولی فکر و نظر اور ذوق و وجدان کا مطالبہ نہیں کرتے بلکہ عمومی قرأت کے بعد اپنے خارجی اکہرے معنی و مفہوم اور کیفیت و تاثر سے ہی عام قاری کو مسرت اور طمانیت بخشتے ہیں۔ لیکن اقبال کے وہ متون، جنہیں تخلیقی متون (Writerly Texts) کہا گیا ہے، عمومی ذوق، معیار اور فکر سے بلند ہیں، ان میں اقبال کے عظیم افکار اور جید شعری و لسانی رویے، غیر روایتی اور منفرد تخلیقیت کے ساتھ سامنے آئے ہیں۔ اس لیے ایسے متون منتخب اور تربیت یافتہ قاری اور معیاری ذوق و نظر کے مطابق ''استغراقی قرأت'' کا مطالبہ کرتے ہیں تاکہ قاری متن میں موجود شعری جوہر معنی و مفہوم یا تخلیقی تجربے کے معنیاتی و جمالیاتی ابعاد کو کھول کر اس کے تمام تر تاریخی، ثقافتی، مذہبی اور علمی و فلسفیانہ التباسات کے ساتھ ربط قائم کر سکے اور اس طور پر کیا گیا ہے، ان پر صحافتی شاعری سے آگے الفاظ کے لسانی و شعری برتاؤ کے سہارے، تہہ در تہہ، متن کی گہرائیوں میں اتر کر غایت درجہ مسرت آمیز بصیرت حاصل کر سکے۔ مسرت آمیز بصیرت یوں کہ اقبالؔ کے اس طرح کے متون میں فنی و فکری ندرت اور تخلیقی و جمالیاتی جدت ایک وحدت میں ڈھل کر اس

طرح سامنے آتی ہیں کہ قاری کے ڈھلے ڈھلائے مذہبی و ثقافتی، شعری و علمی شعور اور تاریخی و نفسیاتی مفروضات کی تقلیب ہوتی ہے اسے رد تشکیل (Deceonstruction) بھی کہہ سکتے ہیں۔ بظاہر یہ قاری کا زیاں ہے لیکن واقعتاً قرأت کی کارکردگی (Role) کے سبب قاری کو متن کے ابعاد کھولنے اور اس کی تہوں سے گزرنے کے بعد نادر و نایاب معنی و مفہوم اور کیفیت و تاثر کی جو دولت ہاتھ آتی ہے، وہ قاری کو مسرت کے ساتھ ساتھ بصیرت سے بھی سرشار کر دیتی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اقبال کے اکثر و بیشتر تخلیقی متون کی خصوصی قرأت کے بعد قاری اول تو حیرت و استعجاب سے دوچار ہوتا ہے اور پھر اجنبی مسرت سے ہمکنار۔۔۔ بحث کے اس مقام پر کھڑے ہو کر اقبال کے دونوں طرح کے متون، قارئین اور قرأت کے حوالے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اقبال کے سبقی یا قرأتی متون ساخت اور معنی کے اعتبار سے سپاٹ ہیں۔ خیالات میں جذباتیت ہے اور اسلوب میں نثریت، کرداروں کے پیچھے سے بھی خود اقبال ہی بولتے نظر آتے ہیں۔ ایسے اشعار اقبال کی اصل تخلیقیت کی بازیافت اور اقبال کی خالص۔ شاعرانہ حیثیت کے قیام میں زیادہ معاون نہیں ثابت ہوتے۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

مسلماں کے لہو میں ہے سلیقہ دل نوازی کا
مروّت حسن عالمگیر ہے مردانِ غازی کا

نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے
جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندۂ صحرائی یا مردِ کہستانی

دل سوز سے خالی ہے نگہ پاک نہیں ہے
پھر اس میں عجب کیا کہ تو بے باک نہیں ہے

یسے اشعار سے پرجوش تبلیغی، جذباتی اور آدرشی سوچ اور فکر کا اظہار تو ہوتا ہے لیکن منفرد لسانی برتاؤ اور تخلیقی رویے کے عناصر کم ہونے کے سبب کوئی قابل توجہ شعری تجربہ سامنے نہیں آتا۔ لیکن ایسے سبقی متون میں بھی بعض ایسے ہیں جن میں کہیں کہیں شاعرانہ شدت اور خصوصاً محاکماتی شاعری کی خوبی پیدا ہو گئی ہے ایسے سبقی متون اکثر تخلیقی متون کے دائرے کے اندر داخل ہو جاتے ہیں مثلاً:

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا اپنا گریباں چاک یا دامن یزداں چاک

مقام پرورش آہ و نالہ ہے یہ چمن
نہ سیر گل کے لیے ہے نہ آشیاں کے لیے

بڑھ کے خیبر سے ہے یہ معرکۂ دین و وطن
اس زمانے میں کوئی حیدرِ کرار بھی ہے

لیکن اقبال کے تخلیقی متون میں اقبال کے افکار و تصورات چونکہ شعری تجربات کے طور پر سامنے آئے ہیں اس لیے ایسے متون فکری اور فلسفیانہ ہی نہیں، شاعرانہ اعتبار سے بھی آفاقی حیثیت رکھتے ہیں اور ان سے ہر بالغ النظر قاری دونوں پہلوؤں سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ یہاں یہ سوال نہیں پیدا ہوتا کہ قاری اقبالؔ کی فکر سے اتفاق کرتا ہے یا اختلاف بلکہ معاملہ یہ ہے کہ اقبال

کے شعری تجربات، فلسفیانہ ہونے کے باوجود ذوق واحساسِ جمال کی تسکین اور تشکیل نو میں معاون ثابت ہوتے ہیں اور ایسے متون سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ شاعر اگر اقبال کے مرتبے کا ہو تو فکری اور فلسفیانہ ہونے کے باوجود بڑی شاعری ممکن ہے۔ خود اقبال بھی اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ شاعری میں عظمت و انفرادیت کا انحصار محض افکار و خیالات پر نہیں بلکہ ان کے اظہار کے لیے الفاظ و تراکیب کی ایجاد و اختراع ان کے غیر معمولی لسانی برتاؤ اور منفرد تخلیقی رویوں پر ہوتا ہے کیونکہ ایسی حالت میں ہی فکر شاعرانہ حدت سے پگھل کر شعری تجربے کے سانچے میں ڈھلتی ہے اور وہ حسن آہنگ پیدا کرتی ہے جو اقبال کا طرہ امتیاز ہے۔ اقبال کے یہاں ''معجزہ فن'' کی نمود کے لیے بار بار ''خون جگر'' کی یاد دہانی اسی سبب سے ہے۔ چنانچہ اقبال کے تخلیقی متون اقبال کے افکار کی عظمت کے ساتھ ساتھ شاعرانہ عظمت کے بھی وافر ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ یہ اقبالؔ کے تخلیقی متون ہی ہیں جن میں اقبالؔ اپنی فکری توانائی، زور بیان اور لسانی و جمالیاتی شعور کی مدد سے مروجہ الفاظ، علائم، استعارات اور تراکیب کو نئی ترتیب دے کر استعمال کرتے ہیں۔ اس سے اقبال کے متون میں نہ صرف تہہ داری اور نیرنگی پیدا ہوتی ہے بلکہ وہ صوتی آہنگ بھی سامنے آتا ہے جو اردو شاعری میں صرف اقبال سے ہی مخصوص ہے۔

اسی طرح تخلیقی متون میں اقبال اپنے تجدیدی جذبہ و احساس، فکر و خیال اور شعری تجربے کے اظہار کے حوالے سے نادرالوجود الفاظ و تراکیب کا قابل قدر سرمایہ بھی فراہم کرتے ہیں۔۔۔ شعر میں تراکیب کے استعمال کے جتنے بھی فائدے بیان کئے گئے ہیں یعنی اختصار، جامعیت، بلاغت اور زور بیان وغیرہ وہ سارے شاعرانہ فوائد اقبالؔ کے تخلیقی متون میں بہ تمام و کمال سامنے آئے ہیں۔ اس باب میں اقبال، غالب پر فوقیت رکھتے ہیں۔ غالبؔ کے یہاں الفاظ و تراکیب کی کمال تہہ داری اور پہلوداری تو ملتی ہے لیکن صوتی آہنگ خال خال ہی نظر آتا ہے جبکہ اقبال کے یہاں الفاظ و تراکیب کے نادر لسانی و شعری برتاؤ کے ذریعے صوتی آہنگ پیدا کرنے کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں مثلاً مسجد قرطبہ میں ''سلسلہ روز و شب'' کی تکرار سے پیدا ہونے والا صوتی آہنگ نظم کے لسانی اور شعری نظام کو ترفع اور ومعنیاتی ساخت کو استحکام بخشتا ہے۔

سلسلۂ روز و شب نقش گر حادثات
سلسلۂ روز و شب اصل حیات و ممات

سلسلۂ روز شب تار حریر دو رنگ
جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات

سلسلۂ روز و شب سازِ ازل کی فغاں
جس سے دکھاتی ہے ذات زیروبم کائنات

''ضرب کلیم'' میں شامل مشہور نظم لا الہ الا اللہ میں بھی لا الَہ الا اللہ کی تکرار صوتی آہنگ ہی نہیں پیدا کرتی بلکہ اقبالؔ کی فکر کو معنیاتی جامعیت اور اثر انگیزی بھی بخشتی ہے۔ اسی طرح لالہ صحرا، ایک شام، مرد مومن، قم باذن اللہ، فقر و راہبی اور مومن وغیرہ نظموں میں الفاظ و تراکیب کے منفرد لسانی برتاؤ سے صوتی آہنگ پیدا کرنے کے علاوہ تصویر کشی، پیکر تراشی اور کیفیت سازی کا کام بڑی مہارت سے لیا گیا ہے۔

غرضیکہ اقبالؔ کے تخلیقی متون میں ہی اقبالؔ کی تخلیقیت اور شاعرانہ عظمت کے اسرار و رموز پنہاں ہیں جنہیں مخصوص و منفرد قاری ہی اپنی استغراقی قرأت کے ذریعے اپنی گرفت میں لے سکتا ہے جبکہ اقبالؔ کے سبقی یا قرأتی متون عام فہم ہیں اور عمومی قرأت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اکہرے اور سپاٹ تبلیغی، ناصحانہ اور جذباتی سوچ اور فکر سے مملو ان متون میں ایسے جمالیاتی عناصر کم ہی ہیں جو اقبالؔ کی ''تخلیقیت'' اور اقبالؔ کی خالص شاعرانہ حیثیت سے متعلق رائے قائم کرنے میں معاون ثابت ہو سکیں۔ اقبالؔ کے متون کی ان دونوں صورتوں کے حوالے سے واضح ہو جاتا ہے کہ اقبالؔ کے قارئین بھی دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو شعر اقبال کے الفاظ کے عام، سطحی اور مروجہ معانی تک ہی محدود رہتے ہیں اور اپنے غیر تجزیاتی ذہن میں موجود طے شدہ تصورات، عقائد اور مفروضات کے مطابق شعر اقبال کو سادہ اور سپاٹ معنی و مطلب پہناتے ہیں۔ ایسے قارئین کو متن (شعر، نظم) میں زبان کی تشکیل اور اس کے تخلیقی و جمالیاتی برتاؤ سے زیادہ سروکار نہیں ہوتا، ان کے لیے لفظ محض ''بولا یا لکھا ہوا معنی'' ہی ہوتا ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

جہاں تک اقبالؔ کے مخصوص قاری کا سوال ہے، وہ صاحب ذوق تو ہوتا ہی ہے، شعری زبان کی تفہیم کا شعور بھی رکھتا ہے، وہ یہ جانتا ہے کہ شاعری میں لفظ صرف معنی نہیں دیتا، معنی و مطلب، کیفیت و تاثر کے لامحدود امکانات بھی فراہم کرتا ہے۔ اسی لیے اقبال کا ایسا قاری زبان کے دروازے سے اقبال کے متن کے اندر داخل ہو کر فنی، فکری، لسانی اور شعری امکانات کو زیادہ سے

زیادہ گرفت میں لیتا ہے جس کے سبب شاعری، صرف موزوں کلام نہیں رہتی، لائق توجہ شعری تجربہ بن کر آپ بھی باوقار ہوتی ہے شاعر کو بھی باوقار بناتی ہے۔ ایسے منفرد و مخصوص قاری کے لیے اردو میں کوئی لفظ نہیں۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اسے ''مرادی قاری'' مانتے ہوئے ''باذوق'' اور ''باظرف قاری'' کہا ہے۔ شمس الرحمن فاروقی کی نظروں میں یہ صاحب ذوق اور شعر فہم قاری ہے۔ مغربی دانشوروں دریدا، اسٹینلی فش، جولیا کرسٹیو اور لاکان وغیرہ نے اس کے لیے مثالی قاری، مرادی قاری، قائل قاری، باصلاحیت قاری اور تربیت یافتہ قاری جیسی اصطلاحات کا استعمال کیا ہے۔ وزیر آغا[۲] بھی ایسے قاری کے لیے Reader Ecrivian کی ہی اصطلاح استعمال کرتے ہیں البتہ سنسکرت شعریات میں اس مخصوص قاری کو ''سہر دئے'' کہا گیا ہے۔ تفہیم شعر کے حوالے سے سہر دئے قاری کی اہمیت پر تفصیل سے بحث کرتے ہوئے آنند وردھن نے ''دھونیہ لوک''(عالم اصوات) میں کہا ہے کہ:

> ''یہ عالم ارضی جس میں ہم جیتے ہیں، ایک حقیر معمولی دنیا ہے جسے ''سنسار'' کہتے ہیں لیکن شاعر، اپنی شاعری میں ایک الگ دنیا کی تخلیق کرتا ہے جسے ''کاویہ سنسار'' (دنیائے شعر) کہتے ہیں۔ سنسار کو کوئی بھی شخص ''عام زبان'' کے ذریعے جان سکتا ہے لیکن دنیائے شعر کے اسرار قاری پر شعری زبان کے ذریعے ہی کھلتے ہیں اور جس طرح عام قاری عام زبان ہی سمجھتا ہے، اسی طرح شعری زبان بھی وہی قاری سمجھتا ہے جو اس کی اہلیت رکھتا ہو۔''[۳]

آنند وردھن کے مطابق اگرچہ ہر بڑا شاعر الفاظ کے سانچے میں ہی کچھ کہتا ہے لیکن اس کا مقصد الفاظ کے جانے پہچانے ابتدائی اور سطحی معانی سے بالکل الگ سامع یا قاری سے ''بہت کچھ'' کہنا ہوتا ہے، شاعر کے اس ''بہت کچھ'' کو عام قاری نہیں سمجھ سکتا۔ سہر دئے(Sahrday) قاری ہی ان تمام تہوں اور طرفوں کو کھول کر متن سے زیادہ سے زیادہ معنی و مفہوم، کیفیت و تاثر اخذ کر سکتا ہے بالکل اسی طرح جس طرح ایک عاشق صادق ہی معشوق کے حسن کو محسوس کر سکتا ہے اور اس سے محفوظ ہو سکتا ہے۔ ابھینو گپت نے ''شعری زبان'' کی تفہیم کی اہلیت رکھنے والے سہر دئے قاری کی تعریف بیان کرتے ہوئے عام قاری کی قرأت اور سہر دئے قاری کی قرأت کے فرق کی بھی وضاحت کی ہے اور کہا ہے کہ جس طرح خشک لکڑی (آگ دکھاتے ہی) آنِ واحد میں جل اُٹھتی ہے اسی طرح کوئی بھی متن (نظم، شعر) جو دل و دماغ کے لیے قابل قبول ہو، سہر دئے

قاری کی قرأت کے ساتھ ہی جمالیاتی محاسن اور معنی و مفہوم کے امکانات کو روشن کر دیتا ہے"[۴]۔
پروفیسر گوپی چند نارنگ نے بھی غالباً سہر دئے قاری اور مخصوص قرأت کو ہی ذہن میں رکھتے ہوئے قرأت کے نتیجے میں متن کے تفاعل سے متعلق کچھ ایسی ہی باتی کہی ہیں:

> "قرأت کے عمل کے ساتھ ہی ذہن میں معنی کی چمک پیدا ہوتی ہے اور کچھ مبہم کچھ روشن شعر اپنا تاثر پیدا کرتا ہے، دوسرے لفظوں میں متن میں معنی کا امکان تو ہے 'متن میں معنی مضمر تو ہیں یعنی متن میں معنی بالقوۃ موجود ہیں لیکن وہ عامل قاری ہی ہے جو متن کے معنی کو موجود بنا دیتا ہے یوں سمجھئے کہ متن بارود کی ٹکیہ ہے' قرأت کا عمل فتیلہ دکھاتا ہے جو اشتعال پیدا کرتا ہے اور یوں وہ پھلجھڑی روشن ہوتی ہے جس کو معنی کا چراغاں کہتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ بارود کی طرح چراغاں کے بعد متن غائب نہیں ہوتا بلکہ جوں کا توں موجود رہتا ہے اور ہر آنے والی قرأت قاری کے ذوق و ظرف کے مطابق از سر نو معنی کا چراغاں کرتی ہے اور یہ عمل لامتناہی ہے"[۵]

لیکن اقبالؔ کے تمام متون میں قرأت کے بعد معنی کے چراغاں کا عمل لامتناہی نہیں ہوتا مثلاً یہ اشعار دیکھئے:

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

وہی ہے صاحب امروز جس نے اپنی ہمت سے
زمانے کے سمندر سے نکالا گوہر فردا

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن

شہید محبت نہ کافر نہ غازی
محبت کی رسمیں نہ ترکی نہ تازی

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

ایسے متون قرأت کے ساتھ ہی پھلجھڑی کی طرح روشن تو ہو جاتے ہیں لیکن معنی و مفہوم کا چراغاں کر کے بجھ بھی جاتے ہیں اور نئے معنی و مفہوم کا چراغاں نہیں کر پاتے ہیں لیکن اقبال کے ایسے اشعار کو پڑھئے:

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدار یار ہو گا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہو گا

محمدؐ بھی ترا جبریل بھی قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرف شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا

تڑپ صحن چمن میں ندیوں میں شاخساروں میں
جدا پارے سے ہو سکتی نہیں تقدیر سیمابی

وہ حرف راز کہ مجھ کو سکھا گیا ہے جنوں
خدا مجھے نفسِ جبریل دے تو کہوں

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

پہلی قرأت سے معنی کا چراغاں ہوتا ہے لیکن اس کے بعد متن سرد تو ہوتا ہے، بجھتا نہیں، معنی و مفہوم کی چنگاریاں اس میں باقی رہتی ہیں اور دوسری قرأت کے بعد متن پھر روشن اور متحرک ہو کر معنی کا چراغاں کرتا ہے اور ہر قرأت کے بعد معنی کے چراغاں کا یہ عمل قاری کے

ذوق اور ظرف کے مطابق جاری رہتا ہے۔ اقبالؔ کے ایسے تخلیقی متون ہر قرأت کے بعد مفہوم کے نئے چراغ روشن کرتے رہیں اس کیلیے سہر دئے قاری کو قرأت کے چند مخصوص آداب کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ پروفیسر حامدی کاشمیری کے مطابق:

> ''قاری کو دو بنیادی باتیں ذہن میں رکھنا ضروری ہے اولاً نظم سے استخراج معنی پر متوجہ ہونے سے قبل اسے لامحالہ جان لیتا ہے کہ وہ حقیقی دنیا سے ایک فرضی دنیائے شعر میں وارد ہوا ہے اس لیے لازماً اسے اس دنیا کے اصول و قواعد کا احترام کرنا ہے۔ اسے نظم کے وجودی الاصل ہونے کو دریافت کرنا ہے جو معنی مطلب نہیں بلکہ تجربہ ہے دوئم نظم سے وہ جس معنی و مطلب یا موضوعیت کا استخراج کرتا ہے وہ حتمی نہیں نظم چونکہ تخلیقی تجربے پر مبنی ہوتی ہے اس لیے کوئی دوسرا قاری اس سے کوئی دوسرا معنی و مطلب نکال سکتا ہے۔''(۲)

حامدی کاشمیری کے اس اقتباس میں سنسار (زمینی دنیا) اور کاویہ سنسار (دنیائے شعر) عام قاری اور سہر دئے (قاری) کے اشارے موجود ہیں ساتھ ہی ساتھ وہ ہر قرأت کے بعد متن سے دوسرے معنی و مفہوم کے اخراج کے امکانات کی بھی تائید کرتے ہیں۔

قاری، قرأت اور متن سے معنی کے استخراج سے متعلق گوپی چند نارنگ اور حامدی کاشمیری کے خیالات قیمتی ہیں لیکن چونکہ اقبالؔ کے متون میں ''فرضیت'' سے زیادہ ''ارضیت'' ہے جو پیچیدہ اور تہہ دار لسانی اور شعری نظام کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ چنانچہ ایک سے زائد قرأت اور غور و فکر کے بعد ارضی معاملات سے آگاہ قاری، اقبالؔ کے متن سے زیادہ سے زیادہ معنی و مفہوم اخذ کر سکتا ہے لیکن اگر وہ قاری اقبالؔ کی زبان اور شعری رویوں کی تہوں کو کھولنے کی استعداد نہیں رکھتا تو وہ اقبالؔ کے متن کی فرضی دنیا(کاویہ سنسار، دنیائے شعر) کے شعری تجربات کا ادراک یا تو نہیں کر سکتا ہے یا پھر کم سے کم کر سکتا ہے اور بالفرض قاری ایسا ہو جو زمینی دنیا کے حالات و کوائف کا شعور بھی رکھتا ہو اور دنیائے شعر کے مضمرات تک بھی اس کی پہنچ ہو تب وہ اقبالؔ کے متن کے فنی، فکری، لسانی اور شعری پہلوؤں کو عامی قاری سے کہیں زیادہ سمجھ سکتا ہے اور چونکہ یہ ممکن نہیں کہ بار بار کی قرأت کے بعد بھی اقبالؔ (یا کسی بھی بڑے شاعر) کے تخلیقی متن میں بند تمام معنی و مفہوم کو گرفت میں لیا ہی جا سکے لہٰذا یہ تو ممکن ہے کہ سہر دئے (قاری) اقبالؔ کے کسی متن کو نہایت اعلیٰ اور عمدہ تصور کرے لیکن اس کے لیے یہ بتانا مشکل ہے کہ اقبالؔ کے اس

متن میں علویت اور عمدگی کہاں ہے کیا ہے کیسی ہے مثلاً اقبال کی کسی بھی نمائندہ نظم کو سامنے رکھیں مثلاً ذوق و شوق کا یہ بند:

کس سے کہوں کہ زہر ہے میرے لیے مئے حیات
کہنہ ہے بزمِ کائنات، تازہ ہیں میرے واردات!

کیا نہیں اور غزنوی کار گہہِ حیات میں
بیٹھے ہیں کب سے منتظر اہلِ حرم کے سومنات!

ذکرِ عرب کے سوز میں، فکرِ عجم کے ساز میں
نَے عربی مشاہدات، نَے عجمی تخیلات

قافلۂ حجاز میں ایک حسینؓ بھی نہیں
گرچہ ہے تاب دار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات!

قل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بت کدۂ تصورات!
صدقِ خلیلؑ بھی ہے عشق صبر حسینؓ بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

اقبالؔ کی یہ نظم (بند) کئی اعتبار سے سبقی متون سے بلند لیکن خالص تخلیقی متون سے پست ہے اس میں بعض ایسے اشعار بھی ہیں جو معنیاتی ہی نہیں لسانی و جمالیاتی اور ایمانی و ایقانی اعتبار سے بھی تہہ داری اور پہلوداری رکھتے ہیں۔ گویا اس نظم (بند) میں ایک خاص بات ہے لیکن وہ ''خاص بات کہاں ہے؟ زبان میں الفاظ و تراکیب کے لسانی و شعری برتاؤ میں؟ جلال و جمال کی آمیزش کے زائیدہ حسن آہنگ میں؟ معنی و مفہوم کی تہہ داری میں؟ مخصوص تصورات میں؟ جذباتی لب و لہجے میں؟ مذہبی حوالوں میں؟ افکار کی فنکارانہ پیشکش میں یا پھر مجموعی تاثر میں؟ اس سوال کا جواب دینا اقبال کے نقاد کا کام ہے۔ اقبالؔ کے سحر دیئے قاری کا نہیں اس کا مقصد متن سے

زیادہ سے زیادہ مسرت حاصل کرنا ہوتا ہے جبکہ نقاد متن کی ساری تہوں کو کھول کر غایت درجہ مسرت حاصل کرتا ہے اور اس میں تجزیہ و تحلیل کی آمیزش کر کے بصیرت بانٹتا ہے۔ یہ نقاد کا فرض منصبی ہے اس لیے سہر دئے قاری کا نقاد ہونا ضروری نہیں لیکن نقاد کا سہر دئے بھی ہونا ضروری ہے۔ سہر دئے قاری اقبالؔ کے متن سے معاملہ کرتے ہوئے اپنے ذوق، نظر مطالعے اور معلومات سے زیادہ کام لیتا ہے۔ منطقی دلائل و براہین سے کم وہ شعر کے ''رس'' یعنی شعری تجربے اور اس کے جمالیاتی مضمرات سے محظوظ ہوتا ہے اور چونکہ ''معنی'' شعری تجربے سے الگ کوئی چیز نہیں اس لیے سہر دئے قاری اپنے ظرف اور معیار کے مطابق متن سے معنی اخذ کر لیا ہے۔ سہر دئے قاری کے لیے زبان اور تخلیقی زبان کی روایات اور وحدت لفظ و معنی حقیقت و مبالغہ رمز و کنایہ اور اظہار بیان کے آداب وغیرہ کی واقفیت بھی ضروری ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ نقاد کی طرح ''علم الشعر'' پر بھی مہارت رکھتا ہو۔ یہاں حقیقت پسند علما(Realists) یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب تک علم نہ ہو، مسرت حاصل ہو ہی نہیں سکتی لیکن یاد رہے کہ شاعری کے حوالے سے علم کی موجودگی سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن شاعری میں علم کا مرکز و محور شعری تجربہ، موضوع یا معنی ہوتا ہے، علم الشعر (Science of Poetry) نہیں۔ شاعر اپنے متن میں کسی نادر شعری تجربے کے فنی و جمالیاتی اظہار سے مسرت حاصل کرتا ہے۔ قاری یا نقاد اس شعری تجربے کے عرفان سے۔۔۔ اقبالؔ کی اس نظم (بند) میں علم کے جتنے بھی پہلو ہیں مثلاً بزم کائنات تازہ واردات، غزنوی، سومنات، سوز عرب، فکر عجم، قافلہ حجاز، دجلہ و فرات، صدق خلیلؑ، صبر حسینؓ اور عشق کی مرکزیت وغیرہ ان سب کا تعلق نظم کے بنیادی شعری تجربے سے ہے۔ ''علم الشعر'' کے مضمرات سے نہیں چنانچہ اقبالؔ کا مخصوص (سہر دئے) قاری قرأت کے ذریعے اقبالؔ کے اس متن میں موجود شعری تجربے معنی و مفہوم کو اپنی زبان فہمی، ذوق و ظرف، سماجی و ثقافتی انسلاکات اور شاعری کا مفہوم بھی روایات اور آداب کی روشنی میں گہرائی سے محسوس تو کر سکتا ہے لیکن اس نظم (بند) میں وہ خاص بات کہاں ہے۔ دلائل کے ساتھ اس کی نشاندہی کرنا قاری کا نہیں نقاد کا کام ہے۔ نقاد ہی زبان، ثقافت، شاعری اور علم الشعر کی رو سے اس خاص بات کی نشاندہی کر سکتا ہے ویسے یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ چونکہ ماحول زمانہ اور سروکار کے ساتھ ذوق بھی بدلتا رہتا ہے اور الفاظ کی معنویت، کیفیت اور اثر انگیزی میں بھی تبدیلی آتی جاتی ہے لہٰذا سہر دئے قاری ہو یا معتبر نقاد یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ اقبال (یا کسی بھی شاعر) کی نظم یا شعر کے تمام پہلوؤں کو گرفت میں لے

سکے۔ شمس الرحمن فاروقی نے لکھا ہے کہ ''شعر شور انگیز میں بہت سے اشعار ایسے ہیں جن پر دل کھول کر بحث کرنے کے باوجود مجھے ایک طرح کا احساس شکست ہی ہوا کہ شعر میں جو بات مجھے نظر آئی میں اسے پوری طرح بیان نہ کر سکا''۔ اسی لیے شمس الرحمن فاروقی نے باذوق اور شعر فہم قاری کے تصور کو فرضی اور عینی قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ صاحب ذوق قاری ایک فرضی یا غیر قطعی اور غیر تنقیدی تصور ہے۔۔۔ جو لوگ صاحب فہم قاری کا حوالہ دیتے ہیں وہ دراصل صرف اپنا حوالہ دیتے ہیں لیکن فاروقی یہ بھی مانتے ہیں کہ اقبالؔ دنیائے ادب کے واحد شاعر ہیں جنھوں نے پانچ ادبی تہذیبوں کو جوڑ کر اپنی شاعری میں سادہ اور سپاٹ اشعار میں بھی پیش کیا ہے او رپھر عالمی سطح پر یہ بھی مانا جانے لگا ہے کہ عصر حاضر کے بحران اور انتشار سے انسان کی نجات کی ایک راہ اقبال کے جہاں فکر و فن سے بھی نکلتی ہے لہٰذا بحیثیت شاعر اقبالؔ کی تفہیم کے لیے سہر دئے قاری کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔۔۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یوں تو سادہ عام فہم اور سپاٹ اشعار پر مشتمل اقبالؔ کے سبقی متون بھی، جن میں کسی نہ کسی حد تک جدلیاتی الفاظ اور تلمیحات وغیرہ کا بھی استعمال ہوا ہے، عام اور عمومی سے ذرا بلند قاری اور قرأت کا مطالبہ کرتے ہیں لیکن خصوصیت کے ساتھ اقبالؔ کے غیر روایتی تخلیقی متون کی تفہیم کے لیے نقاد اور شارح سے قطع نظر اقبالؔ کے قاری کا بھی تربیت یافتہ صاحب ذوق و فہم اور مرد ظرف و نظر یعنی سہر دئے ہونا ضروری ہے لیکن سوال یہ ہے کہ آج کی ثقافتی صورتحال میں ایسا سہر دئے قاری کہاں سے آتا ہے وزیر آغا کے الفاظ میں:

> ''کیا وہ فطرت کا عطیہ ہے یا کسی تربیتی نظام کا زائدہ میرے خیال میں دونوں باتیں ہیں۔ ہر قاری Ecrivian قاری نہیں ہو سکتا مگر Ecrivian قاری کے بننے اور سنورنے میں تربیت اور ماحول کا جو حصہ ہے، اسے بھی نظر انداز کرنا ممکن نہیں پھر بھی اگر دو اشخاص کو ایک سی تربیت مہیا کی جائے تو ضروری نہیں کہ دونوں Ecrivian بن سکیں کیونکہ ایسا ہونے کے لیے وہی صلاحیت درکار ہے، جو فطرت کی طرف سے عطا ہوئی ہے۔''(۷)

ایسے اشعار کے لیے عطیۂ فطرت کی بات تو خیر جانے دیں کیونکہ وہ کونسی شئے ہے جو عطیہ فطرت، عطیہ خداوندی نہیں۔ ذرا پہلو بدل کر دیکھیں تو اقبال کے درج ذیل شعر کی تعبیر سہر دئے قاری کو بھی اپنے اندر سمیٹتی نظر آئے گی۔

مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسن معنی کو
کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنابندی

اور جہاں تک شعر اقبال میں فکر و نظر اور تخلیقیت کے جادو کا سوال ہے، اقبال اسے بھی فطرت کا فیض ہی مانتے ہیں۔

جمیل تر ہیں گل و لالہ فیض سے اس کے
نگاہِ شاعر رنگین نوا میں ہے جادو

لیکن اقبالؔ کے یہاں زبان، زندگی، زمانہ انسان، ثقافت، مذہب، مقصدیت اور روایت اور جدت، ہیئت اور موضوع، ایجاد و اختراع، رد تشکیل اور تجربہ اور اسلامی جمالیات کے حوالے سے عجائبات کا جو طلسم خانہ موجود ہے اس میں داخل ہونے کے لیے قاری کا ایک مخصوص ماحول اور مزاج کے ساتھ تربیت یافتہ ہونا ضروری ہے کیونکہ اقبالؔ کی تفہیم کے حوالے سے قاری اور قرأت کی بحث ہم اکیسویں صدی کی دہلیز پر کھڑے ہو کر گلوبلائزیشن، شیئیت (Commoditification) انفارمیشن ٹیکنالوجی کے فروغ اور صارفیت (Consumerism) وغیرہ کے سبب اردو کے سب سے بڑے منطقے ہندو پاک میں بھی ثقافتی منظر نامہ تیزی سے بدل رہا ہے۔ شکم کی آنکھوں سے ہر شئے کو ''نفع'' اور ''نقصان'' کے زاویوں سے دیکھنے کا چلن عام ہو چکا ہے اور شعر و ادب کو ''غیر افادی'' قرار دے کر نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ اردو کی تہذیبی جڑیں خشک ہو رہی ہیں۔ تقلید اور مسابقت کی عام فضا میں بڑے شاعروں کی تہہ دار شعری نہج Complex poetic pattern کو گرفت میں لینے اور ان کا تجزیہ کرنے اور ان سے محظوظ ہونے والے ذہنوں کی تشکیل و ارتقاء کا عمل گویا رک سا گیا ہے۔ شعر و ادب کی روایات، اجتہادات، اقدار اور تقاضوں کی آگاہی رکھنے والے شرفا، ادباء، اساتذہ اور ناقدین کے طفیل اردو میں ادبی سرگرمیاں تو جاری ہیں لیکن مابعد جدید ثقافتی صورتحال کے زائیدہ نئے ڈسکورس کے زیر اثر اردو زبان کی تہذیبیت Culturology سکڑتی جا رہی ہے۔ اردو شاعری خصوصاً غزل اور نظم کی شعریات کے دائرے پگھل تو رہے ہیں لیکن معتبر شکلیں اختیار نہیں کر پا رہے ہیں۔ اسی طرح شعر و ادب کی تفہیم و تعبیر اور تعین قدر کے ضمن میں مغربی کے لسانی و ادبی اصول و نظریات (Theories) کا عمل دخل تو بڑھ رہا ہے لیکن مشرقی شعریات، خصوصاً عربی، فارسی (اور کلاسیکی اردو شاعری) کی شعری کر رہے ہیں جبکہ گلوبلائزیشن، روایات، لفظیات، آداب، علم معنی کے موضوعات اور فنی و جمالیاتی مضمرات سے ہمارے رشتے

تقریباً ٹوٹ سے گئے ہیں اور چونکہ اقبال کی شعری کائنات میں یہ تمام عناصر کلیدی حیثیت رکھتے ہیں اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ اقبال کی تخلیقیت نئی نسل کے قاری کے ذوق نظر اور زبان فہمی کے معیار سے حد درجہ بلند چیز ثابت ہو رہی ہے۔ چنانچہ والری سے لے کر فش(Stainly Fish) تک قرأت کے ذریعے متن پر قاری کے حاوی ہونے اور آئیزر(Wolf Gang Iser) اور پونلیٹ (George Ponlet) وغیرہ نے متن میں قاری کی تخلیقی شرکت سے متعلق جو تصورات پیش کئے ہیں، اقبال شناسی کے ضمن میں ان کے اطلاقی امکانات سہر دئے قاری اور شعر اقبال کی قرأت کے نئے آداب کے ذریعے ہی روشن ہو سکتے ہیں۔اس ضمن میں پہلی شرط لسانی اہلیت (Competence Linguistic) کی ہے۔ یہ اہلیت ہی قاری کو اقبال کا سہر دئے قاری بنا سکتی ہے اور اسی کے ذریعے وہ شعر اقبال کے لسانی پردوں میں چھپے ہوئے معنی و مفہوم کیفیت و تاثر کو زیادہ سے زیادہ گرفت میں لے کر مسرت اور بصیرت حاصل کر سکتا ہے کیونکہ کسی بھی متن کے اندرون میں داخل ہونے کے جتنے بھی دروازے ہیں، ان میں سب سے اہم زبان کا دروازہ ہے۔ لیکن اتنا ہی کافی نہیں شعر اقبال کی فکری اور معنیاتی تفہیم کے ساتھ ہی اس کی فنی اور جمالیاتی تفہیم بھی ضروری ہے اور اس کے لیے جوناتھن کلر کے کلیے کی روشنی میں یوسف حسین خان، آل احمد سرور، پروفیسر گوپی چند نارنگ، شمس الرحمن فاروقی اور اسلوب احمد انصاری سے لے کر پروفیسر عبدالمغنی، حامدی کاشمیری، وہاب اشرفی اور شمیم حنفی تک کے یہاں شعر اقبال کی قرأت کے تمام دستیاب آداب(Conventions Set of Reading) کو سامنے رکھ کر شعر اقبال کی قرأت کے نئے اصول وضوابط وضع کرنے ہوں گے اور ان کی بنیاد پر قاری کے ذوق ظرف، زبان فہمی اور زمانہ شناسی کی قوتوں کے فروغ کے لیے قاری کی تربیت پر بھی توجہ دینی ہوگی کیونکہ اقبال کی تخلیقیت اور اقبال کی خالص شاعرانہ حیثیت کی نئی بازیابت کے لیے قاری کی مخصوص قماش اور قرأت کے نئے آداب کی ضرورت جتنی آج ہے، پہلے کبھی نہیں تھی۔

حواشی

۱. پروفیسر گوپی چند نارنگ، ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات ص۳۹۸
۲. شمس الرحمن فاروقی۔ شعر غیر شعری اور نثر ص۱۲۳
۳. ڈاکٹر وزیر آغا، مقالہ۔ لکھاری۔ لکھت اور قاری، مشمولہ ترقی پسندی جدیدیت اور مابعد جدیدیت مرتبہ ڈاکٹر ندیم احمد ص۴۳۰
۴. Indian Aesthetics and Poetics- V.N. Jha P 2-3
۵. ایضاً
۶. پروفیسر گوپی چند نارنگ، ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات ص۲۷۹
۷. پروفیسر حامدی کاشمیری، تجربہ اور معنی ص۸۱
۸. ڈاکٹر وزیر آغا، لکھاری، لکھت اور قاری، مشمولہ ترقی پسندی جدیدیت اور مابعد جدیدیت مرتبہ ڈاکٹر ندیم احمد ص۴۳۰